ہیں خصوصاً بڑے فرزند و جانشین برادر محترم حضرت مولانا قاری حافظ سید ابومعاویہ ابوذر بخاری صاحب تو ماشاء اللہ دینی و دنیاوی علوم میں نہایت اعلیٰ استعداد کے مالک ہیں۔ خیر المدارس کے فاضل ہیں۔ اور تعلیم و تعلّم کا خاص ذوق اور بے پناہ جوش رکھتے ہیں۔ عربی اور اردو کے صاحب طرز ادیب ہیں۔ عربی، فارسی، اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ اور تصنیف و تالیف میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ آپ کو قدرت نے تقریر و خطابت کا بھی خاص ملکہ عطا فرمایا ہے۔ آپ بحر علم کے شناور ہیں اور مطالعہ اور تعلیم و تعلّم سے قلبی شغف و انہماک ہے۔ آپ تبلیغی میدان میں اتر آئیں تو کوئی شک نہیں آپ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے صحیح جانشین ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیا عجب! حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے بعد دینی ضرورت کو آپ محسوس کرتے ہوئے تبلیغی کام کا آغاز فرمادیں۔ وہ دن بڑا ہی مبارک دن ہو گا جس دن آپ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی جگہ پر کھڑے ہو کر تبلیغ دین میں سرگرم عمل ہوں گے۔ اور حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے مقام پر اگر کوئی کھڑا ہونے کا حق رکھتا ہے تو وہ برادرِ محترم حضرت مولانا حافظ قاری سید ابومعاویہ ابوذر بخاری ہی ہیں۔ [له]

اولاد کی تربیت

حضرت رحمہ اللہ نے اپنی اولاد کی تربیت میں کتنی دلچسپی لی اور اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔ اس کا علم مجھے تو حضرت رحمہ اللہ کے وصال کے دن ہوا۔ جب دیکھا کہ اس حادثہ کبریٰ سے ہزاروں آنکھیں اشکبار ہیں۔ اور ہزاروں دل سوگوار ہیں مگر ایک ابوذر بخاری ہیں کہ صبر و ضبط کا پیکر نظر آ رہے ہیں۔ تجہیز و تکفین کی نگرانی خود کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ صحیح اسلامی احکام کی تعمیل میں حضرت علیہ الرحمتہ کا جنازہ بھی خود پڑھاتے ہیں۔

ایک بیٹے کے لئے اپنے باپ کی نماز جنازہ پڑھانا کوئی معمولی کام نہیں بڑے دل گردے کا کام ہے پھر نہ کوئی اضطراب ہے نہ پریشانی۔ آواز میں نہ پستی ہے نہ انحطاط۔

اللہ اکبر کی گرجدار آواز سے جب کالج کے وسیع میدان کی فضا گونج اٹھی تو میرے دل میں جہاں اپنے عزیز بھائی کے بے مثال صبر و ثابت قدمی کی قدر کے جذبات مچلتے تھے۔ وہاں حضرت رحمہ اللہ کے لئے دل سے دعا نکلتی تھی۔ جنکی تربیت نے سید ابوذر بخاری کو اس عظیم مقام پر کھڑا کیا۔

له

الحمدُ للہ! حضرات امیرِ شریعت کے چاروں فرزند، بیٹی اور ان کی اولادیں دین کی تبلیغ، تعلیم اور تدریس میں گزشتہ تیس برسوں سے مصروف کار ہیں۔ شاہ جی کی جماعت مجلسِ احرارِ اسلام کو بہرحال زندہ رکھے ہوئے ہیں۔
(کفیل)

ابا جی اور شاہ جی

مولانا محمد ازہر شاہ قیصرؒ

مجھے بڑے لوگوں سے ان کی غائبانہ شہرت کی بناء پر عقیدت و محبت کے تعلقات قائم رکھنے کا سودائے خام کبھی نہیں ہوا اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ میرے شہر میں کوئی بڑا لیڈر یا بڑا شاعر اور قومی کارکن آیا ہو اور میں شوق تعارف و ملاقات میں اس کی جائے قیام کے ارد گرد گھومتا رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک غائبانہ شہرت اور اس شہرت کی ہمہ گیری کسی انسان کی بڑائی اور بھلائی کا معیار نہیں۔ بڑائی صرف اخلاق کے لئے ہے اور بڑا آدمی وہ ہے جس کے اخلاق معیاری اور بلند ہوں۔

میرا تجربہ ہے کہ بعض بداخلاق اور بے کمال انسان بھی بعض وقتی حوادث سے شہرت پا لیتے ہیں۔ لیکن ان کے قریب جا کر جب ان کے کردار کے کچھ گوشوں کو ٹٹولتے ہیں تو ان میں اچھے اعمال و اخلاق کا کوئی سرمایہ نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء میں جگر، احسان، روش، سیماب۔ اہل صحافت میں مولانا ظفر علی خان، سالک، حامد الانصاری غازی، محمد عثمان فارقلیط قومی رہنماؤں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا حفظ الرحمٰن، ارباب علم و فضل میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، قاری محمد طیب صاحب مولانا احمد علی وغیرہ سے زائد کسی سے میرا تعارف اور تعلق نہیں۔ بڑے آدمیوں کے تعارف و تعلق کے مجھے بہت سے مواقع ملے مگر شاید آپ اس پر اعتبار نہ کریں کہ میں نے خود ان مواقع کو کھو دیا اور کبھی ہر کس و ناکس سے رشتۂ محبت و عقیدت استوار کرنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔

صف اول کے لوگوں میں گاندھی اور جواہر لعل تک میرے قریب سے گرج برس کر گزر گئے لیکن میں نے ذاتی طور پر ان سے تعلق پیدا کرنے میں خود اپنا نقصان سمجھا اور ان بزرگوں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میرا تعلق بہت قدیم، مستحکم اور نیازمندانہ رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین لاہور کے جلسہ میں شاہ جی کو امیر شریعت بنایا گیا تھا اور میرے والد مرحوم کی تائید کے ساتھ پانچ سو علماء کی ایک جماعت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس جلسہ میں میں نے شاہ جی کو دیکھا شاہ جی ان دنوں جوان تھے سرخ و سپید چہرہ، بھرے بھرے بازو، چہرے پر جلال، بدن میں چستی، نگاہوں میں چمک، سر پر شاہ جی نے سادہ کپڑے کی گول ٹوپی پہن رکھی تھی۔ گلے میں رنگین قمیض، قمیض کی آستین صرف بازوؤں تک، پاؤں میں چپل ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا، رات کو میں اسٹیج پر مولوی عبدالحنان صاحب کے پاس پڑا سو رہا تھا کہ کسی شخص کی دھواں دار تقریر سے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ ہمارے شاہ جی تھے جو انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تقریر کر رہے تھے۔ صبح ڈاکٹر عبدالقوی صاحب کے یہاں ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی مجھے اس دن بخار تھا۔ ابا جی نے منع کیا کہ صرف چائے پی لینا۔ مگر شاہ جی انڈے چھیل چھیل کر میری طرف بڑھاتے رہے اور میں کھاتا گیا۔ شاہ جی سے اس پہلی ملاقات کے بعد خلاف عادت میں بہت متاثر ہوا۔ یقین جانئے کہ کئی برس تک اس بچپن کے

عالم میں میرا یہ حال رہا کہ بالکل شاہ جی کی طرح چپل پہنتا رہا۔ ایسی ہی ٹوپی اوڑھتا ایسا ہی موٹا سا ڈنڈا لئے پھرتا اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی مسجد میں سینکڑوں دفعہ طلباء کو گھیر گھار، ان کے سامنے شاہ جی کے لب ولہجہ میں اول فول تقریریں بکا کرتا۔

شاہ جی سے مجھے محبت زائد اس وجہ سے ہوئی کہ میرے والد مرحوم فطرۃً بہت خاموش، دنیاداری سے بالکل الگ ملنے ملانے سے نفور اور تعلقات میں ایک زبردست معیار کے انسان تھے۔ بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی یہ مشکل تھا کہ وہ ابا جی کو متاثر کر سکتا اور ان سے تعریف و تحسین کے دو کلمے پالیتا۔

۳۰ء یا ۳۲ء میں گاندھی نے میرے والد مرحوم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "میں گوشہ نشین فقیر لیڈروں سے ملنے کا سلیقہ نہیں رکھتا"

نظام حیدر آباد نے انہیں گھیر گھار کر اپنے یہاں بلایا۔ کہتے ہیں کہ نظام ترجمہ قرآن کے سلسلہ میں ابا جی سے کوئی علمی خدمت لینا چاہتے تھے اور اس کام کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار تھے مگر ابا جی نے کہا کہ "میں پیسہ لے کر قرآن کی کوئی خدمت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ آپ اس کام سے مجھے معذور سمجھیں" آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے غیر ملنسار اور غیر دنیا دار آدمی کا کسی سے متاثر ہونا واقعی مشکل تھا۔ مگر ابا جی شاہ جی کے سوجان سے دیوانے تھے ہر وقت شاہ جی کا کلمہ پڑھتے ہر وقت انہی کا حال پوچھتے کتاب سے فراغت ہوئی چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سادہ چائے آئی اس کا دور چلا۔ سامنے میرے ماموں جناب حکیم سید محفوظ علی صاحب یا مولانا حفظ الرحمن، مولانا محمد ادریس صاحب، مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی ہوئے اور ابا جی نے سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔

"کیوں مولوی صاحب! ہم عطاء اللہ شاہ کو اگر سب کاموں سے ہٹا کر صرف تردید قادیانیت پر لگا دیں تو یہ کیسا رہے گا۔ مولوی صاحب! یہ صاحب واقعی مخلص ہیں بہت محنتی اور بہت زیادہ بہادر۔ انہوں نے پنجاب میں چند تقریریں کر کے قادیانیت کے خلاف ایک عام جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے اسی طرح محنت سے کام کیا تو قادیانیت ان شاء اللہ ختم ہو جائے گی"۔

شاید سیماب کا شعر ہے کہ۔

خاک پروانہ، رگِ گل، عرقِ شبنم سے
اس نے ترکیب تو سوچی تھی مگر دل نہ بنا

اور واقعہ یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے جاندار اور دھڑکتا ہوا دل بنا لینا بہت ہی مشکل ہے سائنس کی عجوبہ کاریاں اگر متحرک، زندہ اور جاندار دل بنا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو تخلیق اور آفرینش سے ان کا فاصلہ کچھ دور نہیں رہتا۔ مگر جب قدرت نے خود ارادہ کیا تو اس نے پہاڑوں کی سنگینی، بجلیوں کے زور، طوفان کے شور، آندھیوں کی بلاخیزی، بادلوں کی گرج، درختوں کی بلندی، صحرا کی وسعت، صبح کی بہار آفرینی، شام کی رعنائی، راتوں کے سکون، پھولوں کی لطافت، کلیوں کی نزاکت، بادصبا کی شوخی، آبشاروں کے ترنم اور بہت سی متضاد چیزوں کو جمع کر کے ایک وجود بنایا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس کا نام رکھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۶۷ء تک کشمیر سے لے کر راس کماری تک ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر بستی میں چیختا اور چلاتا، روتا رلاتا، ہنستا بولتا، گرجتا برستا پھرتا رہا شاید ہی کوئی شہر ہو جس کی فضاؤں میں بخاری کی تقریروں کی روانی ایک پوشیدہ قوت بن کر جاگزیں نہ ہو۔

ہندوستان کے مسلمان بخاری کو بھول جائیں مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں جب کوئی ایک مسلمان کسی پریشانی سے رویا ہے تو عطاء اللہ شاہ کے آنسوؤں نے اس کا ساتھ دیا ہے جب بھی کسی مظلوم نے اسے آوازدی ہے تو وہ سینہ تان کر اس کی حمایت میں سامنے آگیا ہے۔ گجرات، ملتان، دہلی، علی پور (بنگال)، لاہور، امرتسر، راولپنڈی اور میانوالی کی جیلیں اس کی یادگار ہیں۔ آج نہ سہی ایک وقت ضرور آئے گا جب آنے والی نسلیں ان جیلوں کو بخاری کی قیام گاہ کی حیثیت سے آثار قدیمہ میں شامل کردیں گی۔

آج تاج محل، محل آرٹ کا ایک نشان اور ہندوستان کی عظمت کا ایک باوقار نمونہ ہے۔ وقت مجبور کرے گا کہ امرتسر اور ملتان میں سید عطا اللہ شاہ بخاری کے مکانات کو اپنی تاریخ حریت کی یادگار کے طور پر محفوظ کیا جائے۔

لاہور کے ایک جلسہ میں پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے والے ایک مصنف کے خلاف احتجاج کیا جارہا تھا۔ لاکھوں کے مجمع میں بخاری نے کہا کہ "وہ دیکھو سامنے! خدیجۃ الکبریٰ کھڑی شکایت کررہی ہیں کہ میرے شوہر نامدار کی توہین کی گئی ہے اور لاکھوں مسلمانوں میں سے ایک بھی نہ بولا۔ لو وہ سنو فاطمہ زہرا فرماتی ہیں کہ میرے باوا جان کی بے عزتی کی گئی ہے اور ان کی امت نے کچھ نہ کیا۔" تو لاکھوں کے اس مجمع کی چیخیں نکل گئیں اور سینکڑوں مسلمان عورتوں نے اپنے شیر خوار بچوں کو شاہ کے سامنے پھینک دیا کہ ہم اپنے جگر گوشوں کو ناموسِ رسالت پر قربان کرتے ہیں۔ کوئی اور بھی اگر ایسا جادو بیان خطیب ہو تو مجھے بتاؤ۔

جن دنوں انجمن خدام الدین کے جلسہ میں ابا جی نے شاہ جی کے ہاتھ پر بیعت کی ان دنوں شاید اخبار انقلاب لاہور میں ایک نظم چھپی تھی جسے اس زمانہ کے مشہور اخبار سیاست نے بھی خوب مزے لے لے کر چھاپا تھا اس کے پہلے چند اشعار میں تو نمک کے محصول کے سلسلہ میں ابا جی کے ایک مشہور فتویٰ کا مذاق اڑایا تھا۔ اس فتویٰ کا اس زمانہ میں اس وجہ سے بہت چرچا ہو گیا تھا کہ گاندھی نے اس فتویٰ کو سامنے رکھ کر نمک سازی کی اپنی مشہور تحریک شروع کی تھی۔

اس نظم میں ابا جی کی بیعت کا یوں ذکر کیا گیا تھا کہ

کی ہے اک شاگرد کی استاد نے بیعت قبول — بڑھ گیا ہے مہر سے کس درجہ رتبہ ماہ کا

انقلاب آسماں دیکھو کہ اک ادنیٰ مرید — پیر انور شاہ جیسا ہے عطا اللہ کا

اور بادی النظر میں یہ بات واقعی حیرت انگیز تھی کہ ابا جی، شاہ جی کی بیعت کریں۔ مگر یہاں "میان عاشق و معشوق رمزیست" کا معاملہ تھا۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ مرید نے مرشد میں کیا جوہر دیکھے اور کیوں اس

کے ہاتھ پر بیعت کی ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ شاہ جی کا نام آیا اور ابا جی کے چہرہ پر مسکراہٹ پھیل گئی کسی نے شاہ جی کی تعریف کی تو خوش ہو گئے کسی نے شاہ جی کو برا بھلا تو بگڑ گئے۔

ابا جی کو اخبار پڑھنے کی کبھی عادت نہ تھی مگر صرف شاہ جی کی خبریں معلوم کرنے کے لئے اخبار پڑھنے والوں سے جب خیال آجاتا تو پوچھتے کہ بھائی شاہ جی کی خبر ہے؟ کہیں تقریر کی یا نہیں؟ کہاں ہیں؟ ادھر دیو بند کی طرف تو آنے کی خبر نہیں؟

اللہ اللہ محبت و شفقت کا کیا عالم تھا۔ ایک دفعہ اسی طرح مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آج اخبار میں شاہ جی کی کوئی خبر تھی کہ نہیں؟ میں نے جھنجھلا کر کہا کہ کوئی نہیں؟ فرمایا کہ الجمعیۃ بھی دیکھا تھا یا نہیں؟ میں نے کہا دیکھا تھا اس میں بھی کوئی خبر نہیں تھی ارشاد ہوا کہ اور زمیندار؟ میں اس کھود کرید سے تنگ آگیا لہک کر بولا کہ جی اس میں خبر تھی کہ شاہ جی گرفتار ہو گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے اٹھارہ انیس سال پہلے کا یہ نقشہ جوں کا توں موجود ہے۔ اس طرح کہ گویا یہ واقعہ آج ہی ہوا ہے۔ ابا جی چارپائی پر اپنے کھردرے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سنتے ہی اٹھ بیٹھے۔ گھبرا کر پوچھا کہ گرفتار ہو گئے؟ کہاں گرفتار ہو گئے؟ بھائی کیا معاملہ ہے ذرا تفصیل سے سناؤ۔ ان کے گھبرا کر اٹھ بیٹھنے اور اس طرح سوالات کرنے سے مجھ کو احساس ہوا کہ میرا یہ جھوٹ ابا جی کے لئے بدرجہ غایت تکلیف دہ ہو گا۔ یہاں تو محض دفع الوقتی کے لئے جھوٹ بولا تھا مگر اب یہ جھوٹ جان لے کر رہے گا۔ پریشان ہوا کہ آخر کیا کروں اور دل نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ اس شاندار جھوٹ کو واپس لے لینے ہی میں عافیت ہے۔

میں نے عرض کیا کہ میں تو ویسے ہی مذاق کر رہا تھا۔ شاہ جی کہیں گرفتار نہیں ہوئے۔ ۱۴ مئی کو دہلی میں جلسہ ہے شاہ جی اس جلسہ میں شرکت کے لئے دہلی آنے والے ہیں

بے ساختہ فرمانے لگے کہ نعوذ باللہ جھوٹ کسی ضرورت اور حاجت سے بولا جاتا ہے۔ آپ کچھ عجیب طرح کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ بظاہر جھوٹ بولنے میں آپ کا کوئی نفع نہیں تھا مگر آپ نے بے ساختہ جھوٹ بولا۔ گویا آپ ضرورتاً نہیں بلکہ عادۃً جھوٹ بولتے ہیں۔ حق تعالیٰ آپ کو ہدایت فرمائے۔ آپ کو نیک عمل کی توفیق دے۔ آپ کا حال تو ہمارے نزدیک بہت افسوس ناک ہوتا جا رہا ہے۔

شاہ جی ایک دفعہ دیو بند تشریف لائے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ساتھ تھے۔ اور قیام ہمارے ہی مکان پر تھا۔ میں ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ہم جس مکان میں اب مقیم ہیں اس مکان میں بھی ابا جی سات سال تک ہمارے ساتھ رہے مگر اس سات سال کے عرصہ میں صرف ایک مرتبہ یہ موقع آیا کہ ابا جی گھر کے باورچی خانہ میں تشریف لائے۔ صرف ایک مرتبہ اور یہ موقع وہی تھا جب شاہ جی ہمارے مہمان تھے ابا جی نے باہر سے آتے ہی والدہ کو آواز دی۔ وہ باورچی خانہ میں تھیں۔ آواز کا جواب نہ دے سکیں۔ جلدی سے ابا جی باورچی خانہ میں تشریف لے آئے۔ اماں سے فرمانے لگے کہ ارے سنتی ہو! آج ہمارے ایک بہت۔ معزز مہمان آیا ہے۔ بہت زیادہ معزز۔ اس کی تواضع اور مہمان داری بہت اچھی طرح کرنی چاہیئے۔ ابھی کسی ہمسائے کے یہاں سے ایک دو مرغ منگواؤ۔ ان کا شوربا پکا لو۔ چاول پکاؤ کوئی میٹھی چیز بھی پکا لو۔ شام کو بڑے

سلیقہ اور فراغت سے مہمان کو کھانا کھلاؤ"۔

آپ لوگوں کے نزدیک یہ کوئی بات نہ ہو گی۔ کہ ہر شخص اپنے مہمانوں کی تواضع کرتا اور انکی مدارات کے لئے مختلف اہتمام کرتا ہے مگر اباجی کا معاملہ عام لوگوں سے الگ تھا۔ ان باتوں اور جھگڑوں سے ان کی بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ میں نے قرآن شریف ناظرہ سے شروع کر کے پورا حفظ کر لیا اور اس میں مجھے دو تین سال لگے۔ مگر اباجی کو اس ساری مدت میں یہ نہ معلوم ہوا کہ ازہر کیا پڑھتا ہے۔ جس دن میں قرآن کے حفظ سے فارغ ہوا۔ اس دن مولانا سراج احمد صاحب رشیدی مرحوم نے جو اباجی مرحوم کی مجلس علمی کے ایک ممتاز رکن اور اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے اباجی کو مبارک باد دی۔ فرمانے لگے "یہ تو ہماری توقع اور علم کے بغیر ایسا ہو گیا ہے۔ ہمیں اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ ازہر حفظ کر رہا ہے اور حفظ بھی اب ختم ہو گیا ہے"۔ آپ اندازہ کیجئے کہ جس شخص کو دنیا داری سے اتنی بے تعلقی ہو شاہ جی کے حال پر اس کا یہ التفات، یہ محبت اور یہ توجہ قابل ذکر چیز ہے یا نہیں؟

شاہ جی کا تعارف اباجی سے مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے کرایا تھا۔ وہی اس آزاد منش، رند پارسا کو گھیر گھار کر اباجی کے پاس لائے اور پھر مدت العمر دونوں ان کی بارگاہ میں مقبول رہے۔

قادیانیت کے سلسلہ میں شاہ جی نے جتنا کام کیا سب اباجی کے اشارہ و ارشاد پر شاہ جی کی تقریریں پسند کی جاتیں۔ تو اباجی کا سیروں خون بڑھتا۔ وہ تردید قادنیت کے لئے لمبے لمبے دورے کرتے تو اباجی کی نگاہ ان کے ہر قدم پر رہتی۔ ڈابھیل میں مسجد مدرسہ میں انکا معمول تھا کہ جمعہ کو تقریر فرمایا کرتے۔ ایسی تقریر جس میں صرف مغز مغز ہوتا تھا۔ الفاظ بالکل نہیں۔ نہ کوئی ابتداء ہوتی تھی اور نہ انتہا۔ تقریر ختم کر چکے مجمع اٹھ گیا۔ خود منبر سے اتر آئے مگر کوئی بات پھر ذہن میں آ گئی تو دوبارہ پھر منبر پر جا بیٹھے اور تقریر شروع فرما دی۔ ایک دن خطبہ مسنونہ کے بعد صرف یہی مضمون بیان ہوا کہ پنجاب میں ایک صاحب ہمیں مل گئے ہیں۔ صاحب توفیق صاحب صلاحیت صاحب سواد خوب کام کرتے ہیں۔ مولویوں کی طرح نہ خواہش زر میں مبتلا ہیں اور نہ خواہش شہرت میں بس بے چارے محض اللہ کے لئے کام کئے جاتے ہیں۔ ہم نے قادنیت کے متعلق انہیں توجہ دلائی کہ یہ فتنۂ عظیم صحیح اسلام کو جڑ سمیت اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کر بیٹھا ہے۔ آپ کیوں نہ اس فتنہ کے خلاف کچھ کام کر گزریں۔ آپ کا وہ کام دین میں آپ کے لئے نفع رساں ہو گا۔ اور دنیا میں اس سے اہل دین کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ کہہ کر پھر شاہ جی کا نام لیا۔ فرمایا کہ بڑوں سے جو کام نہ ہوا وہ اس غریب نے کر دکھایا (طلباء کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) آپ تو مدرسہ کی روٹیاں کھا کر ہر وقت بحث و مباحثہ میں لگے رہتے ہیں دین کی کوئی محبت آپ حضرات کے دل میں نہیں عطاء اللہ شاہ اگر یہاں آ گئے تو آپ ان سے ملئے وہ عجیب آدمی ہیں۔

میرے خیال میں اباجی کے انہی الفاظ کو سامنے رکھ کر حفیظ جالندھری نے ایک دفعہ کہا تھا کہ دور اول کے مجاہدین اسلام کے گروہ سے ایک سپاہی راستہ بھول کر اس زمانہ میں آ نکلا ہے وہی سادگی، مشقت پسندی یکسر عمل اخلاص اور للہیت جوان میں تھی وہ عطاء اللہ شاہ میں بھی ہے۔

ڈابھیل میں فیض اللہ بنورتی کے نام سے ایک طالب علم تھے اباجی کے یہاں ان کی رسائی صرف اس وجہ سے تھی کہ وہ شاہ جی کی شان میں اپنی انمل اور بے جوڑ نظمیں بڑے بے ہنگم لہجہ میں پڑھ کر سناتے تھے اباجی ہمیشہ اس طالب علم پر توجہ کرتے اسکی مدارت فرماتے اور ہر جگہ اسے یاد رکھتے۔

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

ابھی چند دن ہوئے مولانا حبیب الرحمن ندھیانوی دہلی سے آئے شام کو مغرب کے بعد وہ ان کے دونوں صاحبزادے سعید اور محمد اور میں اباجی کے مزار پر گئے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اباجی اپنے گوشۂ مزار سے مولانا حبیب الرحمن کے سلام کا جواب دیں۔ قبر شق ہو جائے اور اندر سے وقار، سنجیدگی کا وہی پیکر حسین باہر آکر کھڑا ہو جائے جسے دیکھنے کے لئے دور دراز سے لوگ آتے تھے۔ وہی سبز رنگ کا عمامہ، سبز رنگ کا چوغہ، سیاہ غلافی آنکھیں اور خوبصورت چہرہ نظر آجائے۔ جسے اپنے ہاتھوں سے ان کے ہزاروں شاگردوں نے شام کی تاریکیوں میں یہاں دفن کر دیا تھا۔ فاتحہ پڑھ چکنے کے بعد میں دیر تک ان کی قبر پر ٹکٹکی باندھے کھڑا رہا۔ میرے تحت الشعور میں یہی خیال تھا کہ اباجی اب اٹھے اور اب اٹھے مگر ہائے

سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

رات بڑھتی آئی اندھیرا گھرا ہوتا چلا گیا۔ قبرستان میں اداسیاں پھیل گئیں۔ درخت زور زور سے ہلنے لگے۔ ہواؤں کی سنسناہٹ دل کو توڑے لیتی تھی۔ تاریکی اور اندھیرا سرکش جنات کی طرح سر چڑھے جاتے تھے۔ قبرستان کے کسی گوشے سے کسی طالب علم کی تلاوت کی آواز آرہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ باہر نکلا تو عید گاہ کی دوسری طرف سے ہرٹ چلنے کی آواز خاموشی اور سکون کے سینے کو چیرتی اور رات کی تاریکیوں سے لڑتی جھگڑتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ہرٹ کی آواز میں کیا کیفیت ہو سکتی ہے؟ نہ خوشی اور مسرت کا نغمہ اور نہ رنج و غم کی دلدوز داستان مگر میرے دل سے اٹھتے ہوئے رنج و غم کے شعلے ہرٹ کے آواز میں جذب ہو گئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے دل کو کسی نے تھام لیا۔ میرا سانس ٹوٹا جا رہا تھا۔ اسے کسی نے سنبھال لیا میری روح نکلی جا رہی تھی وہ اپنی جگہ تھم گئی۔

جن بزرگوں کے یہ قصے ہیں وہ بزرگ اب مدت ہوئی نظروں سے ایک جلوۂ بے قرار کی طرح اوجھل ہو گئے زمانہ بدل گیا مجلسوں کا رنگ کچھ اور ہے۔ بحث و مباحثہ اور فکر و نظر کا موضع یکسر جدید ہے۔ پچھلی باتوں میں نئے زمانہ کے لئے کوئی دلچسپی نہیں وہ بزرگ اپنے اپنے وقت پر علم و فضل کے آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ مگر آج تو خاک مزار کے سوا ان کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ پہلے کبھی اباجی کی مجلس میں حقائق دین کی گرہیں کھلتیں اور فکر و نظر کے نئے سانچے تیار ہوتے تھے جن پر ان کی نظر پڑ جاتی تھی۔ وہی کام کا آدمی بن جاتا تھا۔ جو قدموں میں آکر بیٹھتا تھا وہی کچھ لے کر جاتا تھا مگر آج ان کے مزار پر خاموشی اور سکون کے سوا اور کیا ہے۔

۷۱ سال کی عمر پوری کر کے شاہ جی نے ۲۱ اگست کی شام کو جان جانِ آفریں کے سپرد کی اور ۲۲ کو بعد ظہر تقریر و خطابت کے اس بادشاہ کو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا۔ شاہ کی موت پر ایک تاریخ ختم ہو گئی ایک عہد گزر گیا۔ ایک دور پورا ہو گیا۔ ایک چمن اجڑ گیا۔ ایک بہار لٹ گئی۔ تقریر و خطابت کی رونق ختم ہو گئی۔

جرأت و شجاعت کا شیرازہ بکھر گیا اور خلوص و دیانت پر افسردگی چھا گئی۔ اب نہ کبھی شاہ نظر آئیں گے نہ ان کی تقریریں سننے کا موقع ملے گا۔ لیکن جب بادل گرجے گا، بجلی چمکے گی، موسلادھار بارش ہو گی، طوفان اور سیلاب آئیں گے، جب کبھی صبح ہو گی اور جب کبھی شام آئے گی، جب کبھی پھول کھلیں گے اور کلیاں مسکرائیں گی، جب کبھی باد صبا پھولوں اور کلیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی چمن سے گزرے گی، جب کبھی کوئی قرآن پڑھے گا، اور جب کوئی رات کی آخری اور خشک ساعتوں میں لاکھوں اور ہزاروں کے مجمع کے سامنے تقریر کرے گا۔ جب کوئی جرم حق گوئی کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے گا، جب کوئی مرد حق اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی عظمت کے لئے اپنے جسم و جان کا نذرانہ وقت کے کسی ظالم اور قاہر کے سامنے پیش کرے گا۔ مجھے اس وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ضرور یاد آئیں گے کہ ان سب چیزوں میں مجھے عطاء اللہ شاہ بخاری کی شباہت ملے گی۔ عطاء اللہ شاہ کی کچھ ادھوری سی نقل، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ۷۱ سالہ مجاہدانہ اور سحر آفریں زندگی اس کے خلوص و دیانت اس کی تقریر و شعلہ بیانی ان کی عظیم الشان شخصیت انکی طویل قومی خدمات، ان کی بے غرضی بے نفسی اور بے ریائی، اس کی حسین جوانی، اس کے پروقار بڑھاپے کو اس کے لاکھوں عقیدت مندوں کو دور افتادہ ازہر کا سلام رحمہُ اللہُ رحمتہً واسعتہً وغفرلہ اللہ مغفرۃً کاملتہً

*

چار چیزوں سے محبت

دنیا میں چار قیمتی چیزیں محبت کے قابل ہیں:

مال

جان

آبرو اور

ایمان

لیکن ۔۔۔۔۔

جب جان پر کوئی مصیبت آئے تو مال قربان کرنا چاہیئے اور اگر آبرو پر کوئی آفت آئے تو مال اور جان دونوں کو۔ اور اگر ایمان پر کوئی ابتلاء آئے تو مال، جان، آبرو سب کو قربان کرنا چاہیئے اور

اگر ان سب کے قربان کرنے سے ایمان محفوظ رہتا ہے تو یہ سودا سستا ہے۔

(امیر شریعت)